AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www.al-aasar.com

Vol. 2, No. 3 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN:3006-6921

جدیدیت کی شعریات: تفہیم اور میراجی کی نظم "خمیازہ" (نظریاتی و عملی محرکات)

منصور خان

لیکچرار اردو، شعبہ اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج چارسدہ

mansoorsahil.urdu@gmail.com

ڈاکٹر محمد عثمان

لیکچرار، شعبہ اردو، جامعہ اسلامیہ پشاور

musman@icp.edu.pk

ڈاکٹر رومینہ بیگم

لیکچرار، شعبہ اردو، جامعہ اسلامیہ پشاور

romina@icp.edu.pk

Abstract:
Modernism refers to the tendency to deviate from old values and traditions and embrace new ideas and experiments. Modern writers and poets chose a unique path for themselves, challenging society's traditional concepts. In Urdu literature, Miraji is among the prominent poets who introduced modernism. He incorporated all the fundamental themes of modernism into his poetry and, through intellectual and artistic experimentation, added new dimensions to Urdu poetry.
Miraji's poem "Khamyaza" tells the story of a man who rebels against old traditions and sets out in search of a new path. However, he finds no peace anywhere. This poem reflects the psychological conflict, loneliness, and restlessness of modern man, caught in a constant clash between tradition and modernity. This internal struggle repeatedly surfaces in Miraji's poetry, which is a key characteristic of modernism.
Thus, Miraji not only promoted modern trends in Urdu poetry but also gave literary expression to the complex questions of human existence. His work stands as a milestone in modern Urdu literature.
Key words: *Modernism, Urdu Poetry, Inevitability, Disappointment .Enlightenment.*

کلیدی الفاظ: جدیدیت، وجودیت، عقل پرستی، تنہائی، نئی نظم، نفسیاتی کرب، دوری، المیاتی کیفیت۔

زندگی ایک جدلیاتی عمل ہے جو مسلسل تبدیلی اور ارتقاء کا تقاضا کرتا ہے۔ جب کسی نظریے میں تبدیلی یا توسیع ہوتی ہے تو اس کے نتیجے میں نئے افکار اور نظریات جنم لیتے ہیں۔ یہ ایک ناقابل انکار سچائی ہے کہ کسی بھی زبان وادب کی ترقی کا انحصار نئے خیالات اور نظریات کو اپنانے پر ہوتا ہے۔ اردو ادب نے بھی مغربی افکار سے گہرا اثر قبول کیا، جس کے تحت ادیبوں نے شعوری اور غیر شعوری طور پر ان نظریات کو اپنایا۔ جدیدیت بھی ادبی ارتقاء کے اس سفر میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو میں جدیدیت کے آغاز پر بحث کرتے ہوئے مغرب میں جدیدیت کی روایت کا اجمالی جائزہ پیش کرنا ضروری ہے۔ جدیدیت کی مغربی ادبی روایت تو انیسویں صدی کے اختتام پر پروان چڑھی اور بیسویں صدی میں اپنے عروج کو پہنچی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ معاشرتی، ثقافتی و علمی انقلاب کی یہ داستان اس سے کئی صدیوں قبل نشاۃ الثانیہ کے دور سے ہی شروع ہو چکی تھی۔ نشاۃ الثانیہ (رینے ساں) (14ویں سے 17ویں صدی) کے دوران یورپ میں ایک انقلابی دور تھا جس نے جدید مغربی تہذیب کی بنیاد رکھی۔ اس دور میں انسانی مرکزیت (جس کو ہیومنزم کہا گیا) اور قدیم یونانی و رومی علوم کو زندہ کیا۔ سائنسی انقلاب، فنون لطیفہ میں حقیقت پسندانہ تخلیقات اور مذہبی

اصلاحات کے نتیجے میں مارٹن لوتھر کی قیادت میں پروٹسٹنٹ ازم کا ظہور ہوا اور چرچ کا اثر کم ہوا۔ پرنٹنگ پریس کی ایجاد اور جغرافیائی دریافتوں نے علم و تجارت کو فروغ دیا۔ تعلیم کے فروغ اور قومی ریاستوں کے عروج نے یورپ کو قرونِ وسطیٰ کے جمود سے نکال کر جدید دور میں داخل کر دیا، جہاں انسانی عقل، سائنس اور ترقی کو مرکزی اہمیت حاصل ہوئی۔ اس دوران روشن خیالی کی تحریک بھی آغاز ہوتا ہے، بہت سے ناقدین روشن خیالی کو نشاۃ الثانیہ سے تعبیر کرتے ہیں لیکن ان دونوں میں بنیادی فرق واضح ہے۔ نشاۃ الثانیہ (Renaissance) اور روشن خیالی (Enlightenment) دونوں یورپی تاریخ کی اہم فکری تحریکیں ہیں۔ نشاۃ الثانیہ 14 ویں سے 17 ویں صدی تک اٹلی سے پھیلی، جس نے قدیم یونانی و رومی علوم و فنون کی تجدید پر زور دیا اور انسانی مرکزیت (ہیومنزم) کو فروغ دیا، جبکہ روشن خیالی 17 ویں سے 18 ویں صدی میں فرانس، جرمنی میں پھیلی، جس کا بنیادی مقصد عقلیت (Reason)، سائنسی ترقی، انسانی حقوق اور سیاسی آزادی کو فروغ دینا تھا۔ نشاۃ الثانیہ نے فنون، ادب اور کلاسیکی علوم کو زندہ کیا اور سائنسی انقلاب کی راہ ہموار کی، جبکہ روشن خیالی نے جمہوریت، سیکولر ازم اور انقلابات (جیسے فرانسیسی اور امریکی انقلاب) کو جنم دیا۔ مختصراً، نشاۃ الثانیہ نے قدیم تہذیبوں کی احیا کی، جبکہ روشن خیالی نے جدید عقلیت اور سیاسی نظریات کی بنیاد رکھی۔ ان نکات کو سامنے رکھ کر محمد حسن عسکری نے بھی یہ وضاحت کی ہے "کہ جدیدیت کی تحریک کی بنیادیں یورپی نشاۃ الثانیہ میں پائی جاتی ہیں"۔(۱)

اسی طرح ڈاکٹر الطاف انجم بھی اپنی کتاب "اردو میں مابعد جدید تنقید" میں لکھتے ہیں:

"مغرب میں نشاۃ الثانیہ کے بعد علمی اور فکری، سماجی اور اصلاحی سطح پر جو نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں انہیں کچھ ماہرین ماڈرنٹی کا نام دیتے ہیں۔(۲)

یہ بات تو واضح ہے کہ جدیدیت کے ابتدائی نقوش نشاۃ الثانیہ (رینے ساں) کے بعد نمایاں ہوئے۔ درج ذیل نکات کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ جدیدیت کی جڑیں اسی دور میں پیوست ہیں:

۱۔ انسان مرکزیت (Humanism) کے تصور کو فروغ ملا، جس میں انسانی وجود اور اس کی اہمیت کو مرکزی حیثیت دی گئی۔

۲۔ عقلیت اور تخلیقی صلاحیتوں پر زور دیا گیا، جس سے انسانی عقل کو فوقیت حاصل ہوئی۔

۳۔ فردی آزادی اور شخصی ترقی کو اہمیت دی گئی، جس سے انفرادی شناخت کو تقویت ملی۔

۴۔ سائنس کو تمام علوم اور عقائد کی بنیاد قرار دیا گیا، جس سے تجربہ اور مشاہدے کو مرکزیت حاصل ہوئی۔

۵۔ مذہبی عقائد اور کلیسا کے اثرات کمزور پڑے، جس سے روایتی مذہبی بیانیہ چیلنج ہوا۔

۶۔ علم کا پھیلاؤ تیز ہوا اور تعلیم عام ہوئی، جس سے معاشرے میں شعور بڑھا۔

۷۔ انسان کی خود مختاری کو تسلیم کیا گیا، جس سے عقل کی کلی حیثیت کو فوقیت ملی۔

ان تمام عوامل نے مل کر جدیدیت کے بیانیے کی بنیاد رکھی۔ ساتھ ہی، روشن خیالی (Enlightenment) کی تحریک، لوتھر کی اصلاحِ دین کی تحریک، انسان دوستی کی تحریک، صنعتی انقلاب، اور سائنسی ایجادات نے بھی جدیدیت کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح، نشاۃ الثانیہ کے بعد کے یہ تصورات آگے چل کر جدید دور کی تشکیل کا سبب بنے۔ وجودیت کی تحریک بھی جدیدیت کے پس منظر میں اہمیت کی حامل ہے۔ وجودیت انسانی آزادی اور ذمہ داری پر مرکوز فلسفیانہ نظریہ ہے جو واضح کرتا ہے کہ انسان بغیر کسی پہلے سے طے شدہ مقصد کے پیدا ہوتا ہے اور اپنے انتخابوں سے ہی اپنی حقیقت تخلیق کرتا ہے۔ اس کا بنیادی نکتہ "وجود جوہر پر مقدم ہے" ہمیں بتاتا ہے کہ ہم پہلے موجود ہوتے ہیں، پھر اپنے اعمال سے اپنا مقصد طے کرتے ہیں۔ یہ نظریہ ایک طرف تو ہمیں لامحدود آزادی دیتا ہے، دوسری طرف اپنے ہر فیصلے کی مکمل ذمہ داری بھی عائد کرتا ہے، جو اکثر گہرے اضطراب کا باعث بنتی ہے۔ سارتر، کامیو اور کیرکگارڈ جیسے مفکرین کے نزدیک اصلی زندگی وہی ہے جہاں انسان معاشرتی دباؤوں سے آزاد ہو کر اپنی حقیقی خودی کے مطابق زندگی بسر کر سکے۔ اگرچہ یہ خیال کہ زندگی کا کوئی فطری مقصد نہیں ابتدائی طور پر مایوس کن لگتا ہے، لیکن وجودیت درحقیقت ہمیں یہ طاقت دیتی ہے کہ ہم اپنے اعمال اور عزم سے اپنی دنیا کو خود معنی بخش سکتے ہیں۔ یہ فلسفہ زندگی کو ایک تخلیقی چیلنج کے طور پر پیش کرتا ہے جہاں ہر فرد اپنی تقدیر کا خود خالق ہے۔ وجودیت میں انتخاب کے عمل کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اور یہی انتخابی عمل جدیدیت کی بھی روح ہے، جو سیاسی، ثقافتی اور سماجی ہر

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www.al-aasar.com

Vol. 2, No. 3 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN:3006-6921

سطح پر فرد کے خود مختارانہ انتخاب کو مرکزی اہمیت دیتا ہے۔ جدیدیت نے ہر شعبۂ زندگی میں ذاتی اختیار اور انفرادی فیصلہ سازی پر زور دیا ہے، جس کے تحت ہر فرد کو اپنے عقائد، رجحانات اور طرزِ زندگی کے تعین کا مکمل حق حاصل ہے۔ اس کی آسان اور واضح تشریح ڈاکٹر اقبال آفاقی اپنی کتاب "مابعد جدیدیت" میں یوں کرتے ہیں:

> وجودیت فرد کے اختیار اور آزادی انتخاب پر زور دیتی ہے۔ فرد جب تک انتخاب نہیں کرتا اس وقت تک اپنی حقیقت کو نہیں پا سکتا۔۔۔ جو شخص انتخاب کرنے سے اجتناب کرتا ہے وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔۔۔ اس کی شخصیت استحکام سے محروم ہوتی ہے انسان کی شخصیت صرف انتخاب کے عمل سے گزر کر تشکیل پاتی ہے۔۔۔۔۔۔ انسان کو لامحدود آزادی عطا ہوئی ہے اسے کسی چیز کا پابند نہیں کیا جا سکتا مستند آزادی مستند وجود کی علامت ہے۔(۳)

درحقیقت، وجودیت کی تحریک نے جدیدیت کو نہ صرف ایک سطحی فنکارانہ رجحان سے بلند کر کے اسے گہرے فکری اور فلسفیانہ بنیادوں پر استوار کیا، بلکہ زندگی اور فن کے بارے میں ایک نیا تنقیدی نظریہ بھی عطا کیا۔ میں نے پہلے بھی اشارہ کیا تھا کہ جدیدیت کے فروغ میں وجودیت کا کردار ناگزیر تھا۔ یہ بات جدید ادب میں واضح طور پر نظر آتی ہے، جہاں وجودیت کے بنیادی موضوعات نے فنکارانہ اظہار کو نئی سمت دی۔ میرے اس موقف کی مزید تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ جدیدیت اور وجودیت کا یہ باہمی ربط صرف اتفاقی نہیں بلکہ ایک تاریخی ضرورت تھی، جس نے بیسویں صدی کے فن وادب کو نئی بلندیوں تک پہنچایا۔

مذکورہ بالا بحث کے تناظر میں جدیدیت اپنے بنیادی تصورات میں عقل پرستی، روایات سے انحراف، مذہب و مابعد الطبیعات پر تنقید، آزادی اظہار، لایعنیت و وجودی شک، سوالیت، فردیت اور انسانی مرکزیت پر مشتمل ہے۔ یہ رجحان انسانی عقل کو حتمی معیار مانتے ہوئے روایات، مذہبی عقائد اور اجتماعی اقدار کو تنقید کی نگاہ سے دیکھتا ہے، جس کے نتیجے میں سیکولرازم، شکوک پرستی اور فرد کی خود مختاری کو فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ بیسویں صدی میں جدیدیت کی یہ فکری بنیادیں ایک طرف سائنسی ترقی، انسانی حقوق اور فکری آزادی کی راہ ہموار کرتی ہیں، تو دوسری طرف بے معنویت، شناخت کے بحران، روحانی بے چینی اور اخلاقی خلا کو بھی جنم دیتی ہیں۔ اس حوالے سے میلان کنڈیرا کا تبصرہ قابل مطالعہ ہے: مفہوم" عالمی جنگوں نے نہ صرف انسان کے اندرونی خیالات اور جذبات کو نئے سوالوں اور پریشانیوں سے بھر دیا، بلکہ اس کی بیرونی زندگی پر بھی گہرے اثرات چھوڑے۔ ادب، فن اور خوبصورتی کے نظریات بدل گئے، اور شہری معاشرے میں ایک نئی تبدیلی آئی جس نے لوگوں کے سوچنے کا انداز ہی بدل دیا۔ سیاست، معاشرت، مذہب اور اخلاقیات ہر سطح پر انسانی رویوں میں نئی تبدیلیاں آئیں۔ معاشرے میں لوگوں کے آپس کے تعلقات، اور انسان اور اس کے ماحول کا رشتہ پہلے جیسا نہ رہا۔ انسان جو کبھی کائنات کا مرکز سمجھا جاتا تھا، خدا کا نائب تھا، وہی اب ٹیکنالوجی، سائنس اور تاریخ کے دباؤ کا شکار ایک بے بس وجود بن گیا۔ ان طاقتوں کے نزدیک انسان کی مادی زندگی، اس کی دنیاوی وجودیت کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی، نہ ہی وہ اس میں کوئی دلچسپی رکھتی ہے۔ یہ گھٹا ہوا وجود ہے، جو ہمیشہ سے نظر انداز کیا گیا ہے۔(۴) المختصر جدیدیت ایک پیچیدہ اور دور خا فکری نظام ہے جس کے اثرات معاشرے، ثقافت اور فرد کی ذات پر گہرے مرتب ہوئے ہیں۔

۱۹۵۵ء کو اردو ادب میں جدیدیت کے آغاز کا سنگ میل مانا جاتا ہے، یہ وہ دور تھا جب ترقی پسند تحریک کی جذباتیت اور اشتراکی نعروں سے اکتاہٹ پیدا ہو رہی تھی، اور ادیبوں نے فن کی خود مختاری، فرد کی انفرادیت اور وجودی سوالات کو مرکزِ توجہ بنانا شروع کیا۔ اس فکری انقلاب کے پیچھے درج ذیل عوامل کارفرما تھے:

۱۔ وجودیت (Existentialism) کا اثر:

وجودیت، خاص طور پر (سارتر، کامیو اور کیئر کگارڈ) کے خیالات، نے اردو کے دانشوروں کو گہرائی سے متاثر کیا۔ یہ فلسفہ فرد کی تنہائی، زندگی کی بے معنویت اور ذمہ داری کے انتخاب پر زور دیتا تھا۔

۲۔ سیاسی و معاشی بحران:

تقسیمِ ہند کے بعد کے انتشار، معاشی ناہمواریوں اور سماجی بے ربطگی نے فنکاروں کو روایتی اقدار پر سوال اٹھانے پر مجبور کیا۔

Vol. 2, No. 3 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN:3006-6921

۳۔ترقی پسند تحریک کا ردِ عمل:

ترقی پسندوں کا "ادب برائے زندگی" کا نعرہ جدیدیت کے زیرِ اثر "ادب برائے ادب" میں ڈھل گیا، اور سماجی مسائل کی بجائے فرد کے داخلی تنازعات مرکز میں رہے۔

۴۔ تقسیمِ ہند کا صدمہ:

تقسیم نے نہ صرف جغرافیائی بلکہ تہذیبی شناخت کو بھی پارہ پارہ کر دیا۔ جدیدیت نے اس بکھراؤ کو فن کا حصہ بنایا۔

ان رویوں نے تخلیق کاروں کو ان کی ذات کے اندرونی خلاؤں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا اور یہی وہ فکری بنیاد تھی جس نے جدیدیت کو اردو ادب میں ایک غالب رجحان کی شکل دے دی۔ بعد ازاں یہ تحریک عصری تخلیقات، فرد کی خود مختاری، داخلی جمالیات اور متن کی آزادی جیسے عناصر کو اپنے اندر سموتی چلی گئی۔ڈاکٹر لطف الرحمان تفہیمی اور تشریحی انداز میں اردو ادب میں جدیدیت کی وجہ سے جو اصطلاحات عام ہوئیں ان کا بیان کرتے ہیں۔"انتشار و بحران۔۔۔مایوسی و نا امیدی۔۔۔بے معنویت و بے گانگی۔۔۔بے زاری و بے کیفی۔۔۔تشکیک و تذبذب۔۔۔اکیلاپن و انفرادیت۔۔۔ماضی پسندی و رومانیت۔۔۔بے زمینی و جلا وطنی۔۔۔انکار و بغاوت وغیرہ وغیرہ"۔(۵)

اسی طرح جدیدیت نے اردو ادب اور ادیبوں کی فکر کو گہرے طور پر متاثر کیا، جس کے نتیجے میں ادبی رویوں اور تخلیقی رجحانات میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ذیل میں جدیدیت کے اثرات اور فکری تبدیلیوں کا اجمالی خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۔جدیدیت نے روایتی پابندیوں کو توڑ کر ادیب کو مکمل تخلیقی آزادی دی۔ اب ادیب کسی مخصوص نظریے یا سماجی دباؤ کے بغیر اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے۔

۲۔واضح بیان کی بجائے ابہام اور پیچیدگی کو ادبی خوبی سمجھا جانے لگا۔ جزئیات پر توجہ بڑھی، جس سے قاری کو تخیل کے وسیع میدان ملے۔

۳۔ادب کا مقصد اب خارجی دنیا کی نمائندگی نہیں، بلکہ فنکار کی ذاتی کیفیات، جذبات اور داخلی کشمکش کا اظہار بن گیا۔

۴۔جدیدیت نے مصنوعی اور صنعتی زندگی کے مقابلے میں فطری ماحول اور سادگی کو ترجیح دی۔ شہریت اور مشینوں کے اثرات کو ادب میں تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

۵۔خارجی خوبصورتی کی بجائے فنکار کے اندرونی احساسات اور نفسیاتی گہرائی کو اہمیت دی گئی۔

۶۔سیدھے اور واضح بیان کی جگہ علامتیں اور تجریدی تصورات استعمال ہونے لگے، جس سے ادب میں گہرائی اور وسعت پیدا ہوئی۔

۷۔جدید ادب میں وجودیاتی سوالات، زندگی کی بے معنویت اور انسان کی تنہائی کو مرکزی موضوعات کے طور پر پیش کیا گیا۔

۸۔سادہ اور عام فہم ادب کی بجائے پیچیدہ اسلوب اور گہرے مفاہیم کو ترجیح دی گئی، جس سے ادب ایک خاص طبقے تک محدود ہوتا گیا۔

۹۔روایتی زبان و بیان سے ہٹ کر نئے لسانی تجربات کیے گئے۔ الفاظ کے معنی، انوکھے اسلوب اور جدید تکنیکوں کو اپنایا گیا۔

۱۰۔ نظم، نثر، افسانہ اور دوسری اصناف کی کلاسیکی شکلیں بدل دی گئیں۔ نئی ہیئتیں ایجاد کی گئیں۔ گویا جدیدیت نے اردو ادب کو ایک نئی فکری اور فنی بلندی عطا کی، جس میں فرد کی انفرادیت، داخلیت اور تجرباتی رجحانات کو مرکزیت حاصل ہوئی۔ میراجی کی شاعری کا محور ان کے داخلی تجربات ہیں۔"خمیازہ" جیسی نظمیں جدید انسان کی بے چینی اور مایوسی کو بیان کرتی ہیں، جو محبت سے محروم رہتا ہے اور اپنی خواہشات کو پورا کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ یہ نظم دراصل عصری تہذیب میں گمشدہ ہو چکے فرد کی المیاتی داستان ہے۔

نظم ملاحظہ کیجیے

تم نے تحریک مجھے دی تھی کہ جاؤ دیکھو
چاند تاروں سے پرے اور دنیائیں ہیں
تم نے ہی مجھ سے کہا تھا کہ خبر لے آؤ
میرے دل میں وہیں جانے کی تمنائیں

اور میں چل ہی دیا غور کیا کب اس پر
کتنا محدود ہے انسان کی قوت کا طلسم
بس یہی جی کو خیال آیا تمہیں خوش کر دوں
یہ نہ سوچا تھا کہ یوں مٹ جائے گا راحت کا طلسم

اور اب ھمدمی و عشرتِ رفتہ کیسے
آہ اب دوری ہے دوری ہے فقط دوری
تم کہیں اور میں کہیں اب نہیں پہلی حالت
لوٹ کے آ بھی نہیں سکتا یہ ہے مجبوری

مری قسمت کہ جدائی تمہیں منظور ہوئی
مری قسمت کہ پسند آئیں نہ میری باتیں
اب نہیں جلوہ گہ خلوتِ شب، افسانے
اب تو بس تیرہ و تاریک ہیں اپنی راتیں (٦)

میرا جی کی یہ نظم "خمیازہ" ان کی فکری گہرائی اور شعری اسلوب کی عکاس ہے، جس میں جدید انسان کی داخلی کشمکش اور وجودی سوالات کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ نظم خارجی حقیقت سے بالاتر ہو کر انسانی ذہن کی پیچیدہ تہوں میں اترتی ہے، جہاں باطنی کیفیات اور نفسیاتی الجھنیں مرکزی اہمیت رکھتی ہیں۔ نظم کا آغاز ایک مبہم مخاطب (تم) سے خطاب کے ساتھ ہوتا ہے جس نے کردار کو اپنے خول سے نکل کر نامعلوم اور لامتناہی دنیاؤں کی سمت بڑھنے کی ترغیب دی تھی۔ یہ تجویز میرا جی کے عمومی انسانی تصور (جو اکثر سست اور غیر متحرک ہوتا ہے) کے برعکس ایک غیر معمولی صورتحال ہے۔ تاہم دوسرے بند میں یہ خارجی مکالمہ داخلی خود کلامی میں بدل جاتا ہے، جہاں کردار سماجی، معاشی اور سیاسی حقائق پر غور کرتا ہوا اپنی محدودیت اور بے چارگی کا ادراک کرتا ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کے مظاہر پر کوئی کنٹرول نہیں رکھتا، بلکہ ایک بیگانے اور محروم وجود کی حیثیت سے زندگی گزار رہا ہے۔ اس سوچ کا ظاہری مقصد تو مخاطب کو خوش کرنا تھا، لیکن نتیجتاً کردار اپنی خوشی کھو بیٹھتا ہے اور وجودی حقائق کے ایک نئے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہاں ایک بنیادی سوال ابھرتا ہے: کیا یہ ناآسودگی اور بے چینی انسان کی فطری کیفیات ہیں، یا پھر یہ اس کے اپنے انتخاب کا نتیجہ ہے؟ میرا جی کا یہ کردار اسی دو دھاری تلاش میں گم ہے، جو جدیدیت کی پیچیدہ روایت کو اجاگر کرتی ہے۔

میرا جی اپنی نظم کے پہلے دو بندوں میں انسان کی بنیادی حقیقت کو دوہرے پہلوؤں (ذہنی و عملی) کے ساتھ پیش کرتے ہیں، جہاں انسان خود کو محروم، تنہا، بے بس، مایوس اور بے معنی وجود کے طور پر پاتا ہے۔ آخری حصہ شاعر کے درد و مسرت کے فلسفے کو سمجھنے کی کلید فراہم کرتے ہیں۔ مصرع "اور اب ہمدمی و عشرتِ رفتہ کیسے" درحقیقت ایک اعلان ہے جو ظاہری و باطنی حقائق کی دریافت کے بعد شاعر کو اس کے مرکزی موضوع کی طرف لے جاتا ہے۔ "آہ اب دوری ہے، دوری ہے فقط دوری ہے" یہی میرا جی کا بنیادی نظریہ ہے - ایک ایسی دوری جس میں شاعر ہر شے کو فاصلے سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ اگرچہ اس نظم میں بھی دوری کا تصور موجود ہے، لیکن یہاں یہ فاصلہ محض جغرافیائی نہیں بلکہ ایک گہرا انفرادی تجربہ بن جاتا ہے۔ شاعر نے اسے مکالماتی اسلوب میں پیش کر کے دوری کے مفہوم کو نئے زاویوں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www.al-aasar.com

Vol. 2, No. 3 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN:3006-6921

میراجی کی شاعری میں ان کے سماجی وجود کی عکاسی واضح نظر آتی ہے، جہاں دنیا کی بھرپور رنگینیوں سے ایک گہری بیزاری اور تخلیقی اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ وہ ہر شے کو اپنی ذات کے آئینے میں دیکھتے ہیں، جہاں ذاتی محرومیاں اور ناکامیاں بھی لذتِ تلاش کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اس نظم کا آخری حصہ ان کے داخلی کرب کا آئینہ ہے جہاں وہ اپنی تاریک راتوں میں گم سم رہنے پر اکتفا کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ نظم بھی ان کی دیگر تخلیقات کی طرح تنہائی اور existential کرب سے عبارت ہے، جو میراجی کے شعری کلام کی بنیادی جہت ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد حسن عسکری، جدیدیت، لاہور: ادارہ فروغ اسلام، ۱۹۹۷، ص ۲۱

۲۔ الطاف انجم، ڈاکٹر، اردو میں مابعد جدید تنقید، لاہور: ناشر بک ٹاک، ۲۰۱۸، ص ۵۵

۳۔ اقبال آفاقی، ڈاکٹر، مابعد جدیدیت (فلسفہ و تاریخ کے تناظر میں)، لاہور: مثال کتاب گھر، ۲۰۱۸، ص ۱۳۴

۴۔ میلان کنڈیرا، ناول کا فن، مترجم، محمد عمر میمن، شہر زاد، کراچی، ۲۰۱۳، ص ۲۳

۵۔ لطف الرحمان، ڈاکٹر، جدیدیت کی جمالیات، صائمہ پبلی کیشنز، انڈیا، ۱۹۹۳، ص ۱۳۹

۶۔ میراجی، کلیات، اردو مرکز لندن، کراچی، ۱۹۸۸، ص ۲۵۱